ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سقوط ڈھاکہ، نظریاتی عدم تشخص اور اردو ناول

The fall of East Pakistan marks a dark chapter in the history of Pakistan. Of this great tragic loss, writers could find little and of minor depth to fill their novels with. There are novels on this subject of course, but they could hardly be called the best and in-depth portrayals of what went during the fall of the East Pakistan. Their category is certainly not the topnotch. As a result of ideological crisis, another division soon occurred.Besides the linguistic disputes and the geographical distancing, the condescending attitude of the leaders of the state was the last straw and paved way for the Bengalis to fight for a separate homeland. The research paper aims to discuss those novels which have depicted this lack of ideological identity, causing the fateful Fall of Dacca.

تحریک پاکستان ہندوستان کے ان تمام علاقوں میں موجود تھی جو مسلم اکثریتی علاقے سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے بنگال بھی اس تحریک کا مرکزہ تھا۔ بنگال میں سیاسی شعور برصغیر کے دیگر علاقوں سے زیادہ تھا اس کی ایک وجہ جدید تعلیم بھی ہے کیونکہ بیرونی جارح سامراج نے سب سے قبل بنگال کو اپنی نو آبادی بنایا اور دولت و اختیار کے حصول کے لیے ہر طرح کے استبداد کو روا سمجھا۔ بعد ازاں یہیں جدید تعلیمی اداروں کی بنا بھی رکھی گئی۔ ہندوستانی سیاست میں بنگال کو کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کانگریس اور بعد ازاں مسلم لیگ کا قیام بنگال کی سرزمین پر ہی عمل میں آیا۔ نو آبادیات نے اس خطے کا ہر طرح سے استحصال کیا اور خطۂ بنگال کے لوگ کئی طرح کے مظالم کا سامنا کر رہے تھے۔ نو آبادیاتی آقا اس شعور کا حامل ہوتا ہے کہ اگر نو آبادیاتی باشندوں کو اپنے حقوق کا شعور حاصل ہو گیا تو پھر نو آبادیات کو اپنے جغرافیائی خطوں میں واپس جانا ہو گا جبکہ نئے اور ترقی کرتے ہوئے صنعتی نظام کی رگوں میں برصغیر کی خام پیداوار کا تازہ دم لہو طاقت کا باعث تھا سو یہ ممکن نہیں تھا کہ سامراج مقامی تہذیبوں اور ثقافتوں کی ترویج کرتا۔ سو ہر ممکن طریقے سے غلامی برقرار رکھنے کی سعی کی گئی۔ اس ضمن میں بنگال میں مصنوعی قحط کی صورتحال پیدا کی گئی، مقامی ہنرمندوں کو بے روزگار کیا گیا۔ مقامی گھریلو صنعتوں پر بھاری ٹیکس لاگو کیے گئے یا پھر وہ صنعتیں بند کر دی گئیں۔ ہنرمند افراد کے ہاتھ قطع کر دیئے گئے تا کہ برصغیر فقط خام مال کی پیداوار کا ذریعہ بنا رہے۔

برصغیر کی سامراج مخالف مزاحمت اور آزادی کی تحریک کا شعور بھی بنگال میں سب سے قبل پیدا ہوا۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا منظر خوشی کا لمحہ کشید ہونے سے قبل ہی غم و اندوہ کی نظر ہو گیا۔ فسادات اور وسطی ہند سے مغربی پاکستان کی طرف ہجرت نے اضمحلال کی کیفیت پیدا کر دی۔ مشرقی پاکستان میں بھی ہجرت ہوئی مگر اس کا تناسب انتہائی کم رہا۔ مغربی حصے میں حکومت کا قیام عمل میں آیا اور مشرقی حصہ جو کہ ارضی دوری پر واقع تھا، اس نے بھی اس حکومت کو قبول کر لیا۔ البتہ بنگالی قومیت کا اظہار قیام پاکستان

کے ساتھ ہی ہونے لگا تھا اور اس کی پہلی وجہ لسانی اختلافات بنے۔اس سانحہ کا ایک اور بڑا سبب جغرافیائی فاصلہ تھا۔ پاکستانی ہئیت حاکمہ میں بڑا حصہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو وسطی ہند سے ہجرت کر کے آئے تھے اس لیے ممکن ہے اور ایسا ہوا بھی کہ وسطی ہند سے ہجرت کرنے والی نسلی جمیعتوں نے اسلامی عقائد ونظریات کو متحدہ قومیت کا مرکزہ بنانا چاہا جبکہ مقامی قومیتوں کے لیے اسلام بطور مذہب ان کی زندگیوں میں رائج ہونے کے باوجود، اپنی تہذیب وثقافت اور زبان سے دوری گوارہ کرنا ممکن نہ تھی۔ قومیت کا ایسا اظہار جو کسی خاص تہذیبی خطے کا صدیوں پر مشتمل ورثہ ہو، بنگال میں شدومد سے ہوا۔ وہاں یہ تاثر بھی جلد ہی پیدا ہو گیا کہ مرکزی حکومت اور مقتدر قوتوں میں بنگال کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ مجموعی قومی پیداوار میں ان کا حصہ زیادہ ہے جو مضبوط مرکز کے نام پر ملک کا مغربی حصہ ہتھیا لیتا ہے۔

حکومت میں مناسب حصہ اور اختیار جبکہ بیورو کریسی میں کوئی بھی اعلیٰ عہدہ بنگال سے نہ ہونے کی محرومی بنگال کے عام آدمی نے بھی محسوس کی کیوں کہ جاگیردارانہ نظام تقریباً نہ ہونے اور جدید تعلیم کے عام ہونے کے باعث بنگال کا سیاسی شعور تقسیم سے قبل بھی تقریباً تمام برصغیر کے افراد کی بہ نسبت زیادہ واضح تھا۔ مثلاً ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مرکز میں مخلوط حکومت کی وزارتوں میں لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، غضنفر علی خان اور جوگندر ناتھ منڈل شامل ہوئے۔ گویا بنگال جہاں سے مسلم لیگ واضح اکثریت سے جیتی تھی، نمائندگی کے لیے کسی معروف مسلم لیگی رہنما کے بجائے ایک اچھوت اور غیر معروف رہنما جوگندر ناتھ منڈل کو کابینہ میں نمائندگی دی گئی جس پر بنگال میں تنقید بھی ہوئی۔ چند دیگر سیاسی واقعات بھی ایسے ہوئے کہ جن میں بنگال کی نمائندگی کو ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ وسطی ہند کے لیگی رہنما ہی بالعموم تحریک پاکستان کے مذاکراتی عمل میں شریک رہے۔ ۵/اگست ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کی اسمبلی پارٹی کے عہدے پر سہروردی کی جگہ خواجہ ناظم الدین کا تقرر کیا گیا اور اس تقرری کو بالعموم بنگال میں ناپسند کیا گیا۔ زاہد چوہدری اسے تحریک علاحدگی کا اولین اقدام قرار دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> اس تحریک کی بنیاد دراصل پاکستان کے قیام سے ہفتہ عشرہ قبل ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو کلکتہ میں رکھ دی گئی۔ جب کہ متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کی بجائے خواجہ ناظم الدین کا مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد کے طور پر انتخاب ہوا تھا۔[۱]

قیام پاکستان کے بعد مرکز میں بنگال کی کم نمائندگی (حالانکہ پنجاب کی نمائندگی بھی کم تھی)، ریاستی عہدوں پر بنگالیوں کا کم تناسب اور فوج میں بھی بنگالی افسروں اور جوانوں کی کم تعداد (اعلیٰ عہدوں پر وسطی ہند کی اشرافیہ اور نچلے عہدوں پر پنجاب اور سرحد (KPK) کے عام طبقات کی قابل ذکر تعداد تھی) کے علاوہ مشرقی پاکستان کے کلیدی عہدوں پر مغربی پاکستان کے افسروں کی تعیناتی اور بنگالی اردو تنازعے نے بھی دونوں حصوں کے مابین ذہنی فاصلے پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ عام بنگالی اس کا ذمہ دار مسلم لیگ حکومت کو سمجھتا تھا اس لیے پہلی بار مسلم لیگ کا عوامی سطح پر ردِعمل ہوا اور مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ نام سے ایک نئی جماعت مولانا بھاشانی کی قیادت میں قائم کی گئی۔ اس جماعت کے جائنٹ سیکریٹری نوجوان شیخ مجیب الرحمان تھے۔ یہی شیخ مجیب الرحمان آئندہ بنگال کے عوامی اور مقبول راہنما قرار پائے۔ مرکز میں آئے روز کی سازشوں اور غیر مستحکم حکومتوں نے بھی بنگالیوں کے غصے میں بدلتے سیاسی شعور کو مفاہمت کے راستے پر لانے کی کوئی چارہ جوئی نہ کی۔ خواجہ ناظم الدین جو کہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر براجمان ہونے والے پہلے بنگالی تھے، کی وزارت کو گورنر جنرل نے آمرانہ اختیار استعمال کرتے ہوئے برطرف کر دیا اور اس اقدام نے بقول صدیق سالک:

گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لیے بغیر موقوف کر دیا، اس لیے بنگالی اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ انھوں نے اس اقدام کو بنگالیوں کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کیا۔[۲]

بعد کی تاریخ مارشل لا، سہروردی حکومت کا خاتمہ وغیرہ بنگالی احساس محرومی میں اضافے کا باعث بنے اور وہاں یہ احساس شدت سے پیدا ہوا کہ بنگال انگریز سامراج کی غلامی سے نکل کر پاکستانی افواج کی غلامی میں آ گیا ہے۔ کچھ دیگر واقعات بھی ایسے ہوئے مثلاً سیلاب کا آ جانا کہ مغربی حصے میں موجود حکومت روایتی نااہلی کے باعث بر وقت امدادی کارروائیاں انجام نہ دے سکی، نے بھی اس محرومی میں اضافہ کیا۔

اردو ادب میں بنگال بہت کم موضوع بنا ہے۔ جدید عہد کے ناول نگاروں کا موضوع بھی وسطی ہند مسلم تہذیب یا پاکستان کے موجودہ خطوں کی تاریخی و تہذیبی صورت گری ہی رہا ہے لیکن بنگال کا موضوع نہ بننا یقیناً حیرت سے خالی نہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان بھی کسی بڑے تخلیقی اظہار سے متصف نہیں ہو پایا۔ سنجیدہ ادب میں ناول کی حد تک محض ''اللہ میگھ دے'' اور ''صدیوں کی زنجیر'' یا پھر سلمیٰ اعوان کا '' تنہا'' خالصتاً مشرقی حصے میں جنم لینے والے سانحے کو موضوع بناتے ہیں لیکن ان ناولوں کا بیانیہ صحافتی رائے سے زیادہ بچ نہیں پایا۔ شاعری اور افسانے میں کسی حد تک مؤثر اظہار ہوا مگر اس کا حصہ مجموعی ادبی سرمائے میں کتنا ہے؟ اس مؤثر اظہار کے نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حاکمیت رکھنے والے اداروں نے ملک کے مغربی حصوں کو مشرقی حصے میں ہونے والی شورش سے مکمل مفقود الخبر رکھنے کے انتظامات کر رکھے تھے اور جب مغربی حصے کے لوگوں نے اچانک اس سانحے کی خبر سنی تو وہ سکتے میں چلے گئے۔ اسے نفسیات کی اصطلاح میں ''اجتماعی سکتہ'' کہا جا سکتا ہے۔ البتہ زندہ قومیں ایسے سانحوں پہ رک کے غور کرتی ہیں، جانچ پرکھ کے بعد نتائج مرتب کرتی ہیں اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے باقی رہ جانے والے پاکستان میں ایسا نہ ہو سکا۔ حمودالرحمٰن کمیشن بنا بھی اور اس نے جانفشانی سے نتائج بھی مرتب کیے لیکن پاکستان کی مقتدر قوتوں نے ان نتائج کو نہ تو عوام کے علم میں آنے دیا اور نہ ہی کمیشن کی سفارشات پر عمل کیا گیا۔ تب سے پاکستانی مقتدر قوتیں محکوم عوام کے ساتھ یہ کھیل کھیلتی آ رہی ہیں کہ ہر قومی سانحے پر ایک کمیشن تشکیل دیا جاتا ہے اور بعد ازاں عوام کو اس کے نتائج سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ دراصل یہ اس نو آبادیاتی نظام کا تسلسل ہے جو برصغیر میں سامراج نے قائم کیا تھا۔ تب بھی نو آبادیات عام لوگوں کو حقائق سے بے خبر رکھتے تھے اور انھیں ایسی حقیقت بتائی جاتی تھی جو نو آبادیاتی مفادات کی محافظ ہو اور آج بھی عوام حقائق سے نابلد رہتے ہیں اور وہی حقیقت انہیں سمجھائی جاتی ہے جو مقتدر قوتوں کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ جب عام افراد درست تاریخ سے آگاہ نہیں ہو پاتے تو ان کا سیاسی شعور ارتقا نہیں کر سکتا۔ اس امر کی وضاحت ڈاکٹر مبارک علی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> تاریخ کو جب بھی توڑا جاتا ہے ماضی کو بار بار حال کے تقاضوں کے تحت بااقتدار طبقوں کے مفادات کی روشنی میں بدلا جاتا ہے، تو اس صورت میں معاشرے کا تاریخی شعور پختہ نہیں ہو پاتا۔ تاریخ ان کے لیے رہنمائی کا باعث نہیں رہتی۔ بلکہ ان کی سوچ اور فکر کو خراب کرتی ہے کیونکہ جب تک پورے تاریخی حقائق سامنے نہ ہوں تاریخی عمل کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی شعور کی ناپختگی کے سبب قوم تاریخ کو بار بار دہراتی رہتی ہے۔[۳]

سقوط مشرقی پاکستان کوئی عام سانحہ نہیں تھا۔ دراصل اس سانحہ نے نظریہ پاکستان پر بھی کاری ضرب لگائی۔ پاکستان کا قیام سیاسی واقعہ تھا اور اس کی بقا بھی صاف ستھری عوامی سیاست میں مضمر تھی لیکن ایک مخصوص ذہن کی حامل ہیئت حاکمہ نے اختیارات پر ناجائز تصرف جمائے رکھا اور عوام کو حق حکمرانی سے محروم رکھا۔ اس سے احساس محرومی کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ آئین ٹالبوٹ

پاکستانی مقتدرہ کو نو آبادیاتی تسلسل قرار دیتے ہوئے پاکستانی قومیت کی ابتدائی الجھنوں کو اس طرح واضح کرتے ہیں:

> پاکستان ایک نئی شناخت لے کر معرض وجود میں آیا لیکن اس کے سیاسی کلچر اور اس کی خصوصیات پر نو آبادیاتی دور کی تاریخی وراثت کا خاطر خواہ اثر پایا جاتا ہے۔۔۔ ان اثرات میں پہلا تو علاقائی تشخص اور مسلم نیشنلزم کا متصادم رشتہ ہے جو کہ تحریک پاکستان کے دوران بھی خصوصاً بنگال اور سندھ میں کچھ زیادہ ڈھکا چھپا نہ تھا۔ دوسرا اثر اسلام اور مسلم نیشنلزم میں نہایت ہی گنجلک اور الجھاؤ پر مبنی رشتہ ہے جو نو آبادیاتی عہد کی یادگار رہے۔[۴]

بنگالی قوم پرستی کو مغربی حصے کی پیدا کردہ محرومیوں نے ہوا دی۔ ممکن ہے کمیشن نے ان سارے امور کا احاطہ کیا ہو جو مشرقی پاکستان کے سقوط کا باعث بنے البتہ ادب اور بالخصوص ناول میں اس محرومی کا اظہار اس سانحے سے قبل ہی ہونے لگا تھا۔ فنکار کا سیاسی شعور درپیش حالات سے دور بین نتائج مرتب کر لیتا ہے۔ مثلاً اردو ناول میں بنگال سیاسی و تاریخی اعتبار سے پہلی بار ''آگ کا دریا'' میں موضوع بنا۔ بنگال کا ثقافتی موضوع جب کمال ابوالمنشور کے نام سے بنگال وارد ہوتا ہے، اس کے ذکر کا یہ محل نہیں ہے۔ البتہ جب کمال تقسیم ہند کے بعد بنگال سرکاری مصروفیات نبھانے جاتا ہے تو مصنفہ کا سیاسی شعور پاکستان کے مستقبل میں جھانک لیتا ہے۔ خیال رہے کہ ''آگ کا دریا'' ناول زیر بحث ۱۹۵۹ء میں منصۂ شہود پہ آیا تھا۔ مصنفہ نے مغربی پاکستان سے گئے ہوئے مقتدر افسران کے برتاؤ سے مستقبل کا دریچہ کھولا ہے۔ مصنفہ نے محض ایک سٹیمر میں بیٹھے لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے جس سے واضح احساس ہوتا ہے کہ اسلامی نظریئے پر قائم ملک اور اسلام کو اپنا فکری ماخذ ماننے والے مقتدر طبقات نے سماج کو کس طرح طبقاتی نظام میں تقسیم کر رکھا ہے:

> جہاز پر داڑھیوں والے چند بوڑھے اور برقع پوش عورتیں آ کر تھرڈ کلاس کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ یہ بھی بڑا ترقی پسند فلموں والا منظر تھا۔ بے شمار بوڑھے ہندو اور مسلمان، شالیں اوڑھے، ان کی لڑکیاں اور بہوئیں گود میں بچے اٹھائے گینگ وے پر سے گزرتی سیکنڈ کلاس میں ٹھنس رہی تھیں۔ اب فرسٹ کلاس میں لوگ آ آ کر بیٹھنا شروع ہوئے۔ کیبن میں گئے، ڈیک پر بکھر گئے، دوربینیں اور کیمرے نکالے گئے، اخبار کھولے گئے۔ دو اسمارٹ بیگمات نے نٹنگ شروع کر دی۔ (آگ کا دریا، ص ۵۷۳)

یہ وہ منظر ہے جہاں مقامی افراد غلاموں کی مانند اپنے آقاؤں کے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہیں سے غصہ جنم لیتا ہے۔ دراصل یہ غصہ اس بے چارگی، بے بسی اور کچھ نہ کر سکنے کے احساس سے جنم لے رہا جہاں ہم وطن اپنے ہی ہم وطنوں کی غلامی پر مجبور ہیں۔ بنگال کے عام افراد کو نو آبادیاتی دور بدلنے کا احساس نہیں دلایا گیا اور ایسا مغربی حصے کی حاکمیت پسند اور سامراج کی تربیت یافتہ افسر شاہی نے کیا۔ عوام تو دونوں طرف مفقود الخبر تھی۔ بنگالی عوام سے مغربی حصے سے جانے والوں کا رویہ ہی تکلیف دہ نہیں تھا بلکہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے دیگر طبقات کا رویہ بھی تحقیر آمیز ہے۔ مثلاً سٹیمر میں کمال اور اخبار نویس کے مکالمے کو مصنفہ یوں پیش کیا ہے:

> اردو اخبار نویس ٹہلتے ہوئے کمال کے پاس آئے اور اپنا تعارف کرایا۔
>
> ''آپ بھی مغربی پاکستان سے تشریف لائے ہیں؟'' انہوں نے پان کی ڈبیا نکالتے ہوئے دریافت کیا۔
>
> ''جی'' کمال نے مختصر جواب دیا ''کراچی؟'' ''جی''
>
> انہوں نے دوبارہ کمال سے ہاتھ ملایا۔'' صاحب ہم تو یہاں یوں سمجھئے کہ کالے پانی میں پڑے ہیں۔ اپنے ہم

جنسوں کے لیے بسا اوقات آنکھیں ترس جاتی ہیں (یہ مغربی یو۔پی کے رہنے والے تھے)۔ سچ عرض کرتا ہوں قبلہ، اس خطے کو تو علیحدہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ بالکل نتھنوں میں دم کر رکھا ہے ہمارا ان لوگوں نے۔''

ایک نوجوان سرل سے باتیں کرتا قریب سے گزرا۔ اخبار نویس اک ذرا کی ذرا رکے۔ جب وہ آگے چلا گیا تو بولے: دیکھا آپ نے انگریزی کیا لاجواب بولتے ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں بس آ گئے جوٹ کوٹا میں۔ (آگ کا دریا،ص۵۳۷)

اس اقتباس میں تین باتیں قابل غور ہیں۔ اول تہذیبی برتری کا احساس، جیسا کہ مصنفہ نے خود لکھا کہ اخبار نویس کا تعلق یو۔پی سے ہے اس لیے وہ خود کو برتر تہذیب کا حامل سمجھتا ہے اور بنگال کو کالا پانی قرار دیتا ہے اور بنگالیوں کو اپنا ہم جنس سمجھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ احساس ایک مخصوص اشرافیہ کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ اس خطے کو الگ کر دینا چاہیے اس کی ایک وجہ اس خطے کا سیاسی شعور ہے جو اپنے حکام کو اپنا جوابدہ بنانا چاہتا ہے جبکہ نوآبادیاتی تربیت یافتہ افسر شاہی خود کو کسی کے سامنے جوابدہ سمجھنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ اگر ریاست نے طوعاً و کرہاً بنگال کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کوٹا کی بنیاد پر سرکاری ملازمتیں دی بھی ہیں تو یہ بھی مہذب کہلانے والے طبقات کے لیے قابل قبول نہیں اور وہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کے لیے بھی حقارت کا ہی رویہ رکھتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں بنگال کے احساس محرومی نے شدید ہونا ہی تھا۔ کسی دوسرے ملک پہ یہ الزام رکھنا کہ اس نے مداخلت کر کے اس حصے کو الگ کر دیا شاید اس وجہ سے زیادتی ہے کیونکہ پاکستانی اشرافیہ کا ذہن اس امر پر آمادہ تھا کہ اس خطے کو الگ ہو جانا چاہیے۔ بنگالیوں کے لیے مغربی حصے کی صاحب اختیار اور ''مہذب'' اشرافیہ کا تحقیر آمیز رویہ یہیں تک نہیں بلکہ وہ مشرقی حصے کے لوگوں کو کاہل، بد دیانت اور چور کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مثلاً جب کمال آس پاس کے مناظر کے سحر میں کھو کر انھیں خوب صورت قرار دیتا ہے تو اخبار نویس تو بنگال کو'' کالا پانی'' قرار دے ہی چکا تھا ایک سرکاری اعلیٰ افسر کا رویہ ملاحظہ ہو:

''کس قدر حسین منظر ہے'' اس نے اپنے آپ سے کہا

جی ہاں'' اعلی افسر نے کہا۔'' ان مناظر کی پبلسٹی کرنے کے علاوہ آپ کی مرکزی حکومت کو اور کوئی کام سجھائی نہیں دیتا۔ مگر بس دور ہی سے یہ نظارے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں رہنا پڑے آپ کو تو اصل حقیقت کھلے۔ ہم کو دیکھیے تین سال سے اس وحشی علاقے میں گویا قید تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔

''قید تنہائی؟''

''جی ہاں اور کیا۔ بالکل بیک ورڈ ملک ہے یہ۔ ذرا یہاں کے باشندوں سے آپ کو سابقہ پڑے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گا۔ ایک سے ایک کاہل، سازشی، متعصب اور بے ایمان۔ ان پر حکومت کرنا اور ان کو قابو میں رکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔''

کمال کو یاد آیا! اٹھارویں انیسویں صدی کے انگریزی سفر ناموں میں اہل بنگالہ اور عموماً سارے نیٹوز کے لیے یہی الفاظ پڑھے تھے ایسے لگا گویا وہ اٹھارہویں صدی کے کسی انگریز کلکٹر کی معیت میں سفر کر رہا ہے۔(آگ کا دریا، ص۵۳۸)

ریاست نے جن افراد کو ان علاقوں کی کسمپرسی بدلنے کے لیے تعینات کیا وہ ان پر حکومت کرنے لگے اور وہی رویہ اختیار کیا

جو انگریز حاکم کا مقامی افراد سے تھا۔ یعنی برصغیر کے لوگ غیر مہذب، جاہل، کام چور اور بد دیانت ہیں جبکہ نو آبادی آقا تمام انسانی اوصاف سے متصف ہیں اور وہ مقامی افراد کو تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ یوں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل بنگال کی کتنی سی تقدیر بدلی؟ نفرت اور حقارت کا یہ رویہ یہیں تک نہیں بلکہ اعلیٰ حکومتی افراد میں بھی یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ ان ''جاہل، کام چور اور بد دیانت'' بنگالیوں سے جلد چھٹکارا حاصل کیا جائے:

> یقین فرمایئے'' اعلی افسر نے بات جاری رکھی، ''جس روز یہ خطہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں گا اور خوشی کے مارے سات روز تک ڈرنک رہوں گا۔ ان کی ہر شے ہم سے مختلف ہے۔ غیر اسلامی زبان بولتے ہیں۔ وزیر اعظم کو پردھان منتری اور امن کو شانتی کہتے ہیں، سنسکرت سے اپنا ناطہ جوڑ رکھا ہے۔(آگ کا دریا،ص۵۳۸)

تہذیبی احساس برتری یہاں بھی نمایاں ہے۔ جبکہ مغربی حصے کے اشرافیہ طبقے کا فکری تضاد بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ یعنی وہ بنگال کے الگ ہونے پر اللہ کا شکر بجالانے کا طریقہ یہ نکالتا ہے کہ سات دن تک مسلسل شراب نوشی کرنا چاہتا ہے۔ دوسری اہم بات کہ مغربی حصے میں ایک لسانی گروہ اپنی تہذیبی برتری قائم رکھنے کے لیے اپنی زبان کو تقدس کو لبادہ پہنا کر بنگلہ زبان کو غیر اسلامی قرار دے دیتا ہے اور ان کا یہ رویہ دیگر پاکستانی زبانوں کے ساتھ بھی تھا۔ یہی وہ فکری انتشار ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر دیگر اقوام کو محکوم رکھنا چاہتا ہے۔ ''آگ کا دریا'' اس حوالے سے مصنفہ کے گہرے سیاسی شعور کا حامل تخلیقی تجربہ ہے کہ انھوں نے بنگال کے حالات اور وہاں پنپنے والی محرومی سے آئندہ کے منظر میں جھانک لیا۔ گو کہ اس صورتحال کو قرۃ العین نے پچاس کی دہائی میں بھانپ لیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ آئندہ آنے والے عرصے میں بھی مغربی پاکستان کے اعلیٰ طبقات کے رویوں میں تبدیلی نہ آئی بلکہ ان میں تہذیبی برتری کا احساس متواتر پختہ ہوتا گیا۔ اس لیے یہ افراد اگر بنگال میں سرکاری یا نجی طور پر جاتے بھی تھے تو ان کے ساتھ گھل مل کر رہنے کے بجائے خود کو ان سے برتر خیال کرتے تھے۔ جس وجہ سے دوریاں اور تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔ قرۃ العین نے جس نفرت اور غصے کا بر وقت ادراک کر لیا تھا بالآخر بنگال میں مغربی پاکستان کی اشرافیہ اور عام افراد کو اس کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً سلمی اعوان کا ناول ''تنہا'' جو کہ سقوط ڈھاکہ کے المیے کے پس منظر میں لکھا گیا، کا ایک کردار اپنے رویے کی وضاحت یوں کرتا ہے:

> تمہارا دل لرزتا ہے جب ہمارے باغیانہ خیالات تم پر ظاہر ہوتے ہیں، تم کانپ جاتی ہو جب ہم علیحدگی کا نعرہ لگاتے ہیں، یہ سب تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے کہ ایسا کیونکر ہوا، ہمیں بھی اس ملک سے محبت تھی، ہم نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی، اس سے ہم نے بھی بہت سی توقعات وابستہ کی تھیں، پھر حالات نے ہمیں سمجھایا کہ ہم سازشی ہیں، اول درجے کے کاہل، نااہل اور نکمے ہیں، ہم میں تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، ہم شورش پسند اور فتنہ پرور ہیں۔(تنہا،ص۲۲۴)

بعینہ وہی الفاظ ہیں جو قرۃ العین کے محولا بالا اقتباس میں مندرج ہیں۔ گویا دونوں فنکاروں نے زمانی بُعد کے باوجود نتائج کا استنباط ایک سا کیا ہے۔ جس خطرے کی نشاندہی قرۃ العین نے ''آگ کا دریا'' میں کر دی تھی اس کے منطقی نتائج ''تنہا'' اور ایسے دیگر ناولوں میں نظر آئے۔ مغربی پاکستان کی ریاستی اختیار کی مالک اشرافیہ کا یہی رویہ تھا جس نے بنگالیوں کو بالآخر الگ وطن کے حصول کے لیے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے پر مجبور کیا۔

مؤرخ اور ناول نگار میں یہی فرق ہے کہ مؤرخ واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اس کے اسباب و علل کا تجزیہ کر کے نتائج

مرتب کرتا ہے لیکن ناول نگار کی بصیرت اسے ماضی کے تجربات کی روشنی میں آئندہ کے واقعات سے آگاہ کر دیتی ہے۔ موجود عصر کی رمز شناسی اور اس کے آئندہ پر مرتب اثرات قرۃ العین کے عصری شعور کا خاصہ ہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان سے قبل کسی اور ناول نگار نے اس سانحہ کی پیش بینی نہیں کی البتہ فضل کریم احمد فضلی کے ناول ''خون جگر ہونے تک'' میں بنگال کے سماجی و سیاسی استحصال، قحط اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی مایوسی، نا امیدی اور لاچارگی کا اظہار ملتا ہے۔ یہ ناول پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا لیکن اس کا موضوع ۱۹۴۱ء میں بنگال میں پھیلنے والے قحط کو محیط ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے عین عروج میں بنگال میں یہ قحط پھیلا۔ عمومی خیال ہے کہ افواج انگلیشیہ میں بھرتی کے لیے درکار افرادی قوت مہیا کرنے کی خاطر اس قحط کو پھیلنے دیا گیا۔ خود مصنف لکھتے ہیں:

> قحط بنگال میں دبے پاؤں آیا۔ اس طرح کہ پتہ ہی نہ چلا، زندگی کی چہل پہل، لہر بہر جاری رہی، مگر رفتہ رفتہ قہقہوں میں کھوکھلا پن پیدا ہونے لگا۔ خوشی کے آنسو غم کے آنسو بننے لگے، زندگی کا بازار سرد پڑنے لگا۔ موت کا بازار گرم ہونے لگا۔ ''قحط قحط'' کی بھیانک صدائیں کانوں میں آنے لگیں، کانوں میں تیل ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ تیل بھی لو دینے لگا، بالآخر ماننا پڑا کہ بنگال میں واقعی قحط پڑا ہے۔ (خون جگر ہونے تک، ص د)

بنگال کا شمار برصغیر کے زرخیز خطوں میں ہوتا ہے۔ لیکن سامراج نے بنگال کی دستکاریوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تباہ کیا اور ''دوامی بندوبست'' کے ذریعے بنگال کے کسانوں کا بھی استحصال کیا گیا۔ گویا بنگال میں موجود احساس عدم تحفظ تقسیم برصغیر سے قبل ہی موجود تھا اور وہ مرکز کی حکومتوں سے ہمیشہ شاکی رہے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ بنگال کی دولت بنگال اور بنگالی عوام پر خرچ نہیں ہوتی بلکہ سامراج اسے اپنے دیس لے جاتا ہے۔ مصنف کا اپنا رویہ مذہبی ہے اس لیے وہ اشتراکیوں کے تو خلاف تھے ہی، مسلم لیگ کے بھی خلاف ہیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> مصنف نے اس ناول میں مشرقی بنگال کی دیہی زندگی، وہاں کے باشندوں کی امن پسندی، وہاں کے فطری حسن، دریاؤں کے جلال اور ذہنوں کی شعریت کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اس پیش کش میں ان کا رویہ غیر جانبدارانہ نہیں ہے۔ مذہبیت ان کے فن پر حاوی ہے اس لیے وہ اشتراکیوں کے کرداروں کو ناپسندیدہ شکل دے دیتے ہیں اور اسلام پرستوں کو اعلیٰ کردار وصفات کا حامل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ آزادی سے پہلے کے بنگال کی سیاسی فضا کو اس ناول میں ایک حد تک کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔[۵]

ناول کا بنیادی موضوع قحط کی صورتحال ہی ہے۔ ناول کا ماجرا کمزور ہے اور ہر طرح کی ترغیب کے باوجود ناول قارئین کی توجہ حاصل نہ کر سکا۔ ناول کی یہ اہمیت ضرور ہے کہ اس میں بنگالی عوام کے ذہنوں میں راسخ ہونے والے احساس محرومی کی ابتدائی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔

سقوط مشرقی پاکستان تاریخ پاکستان کا سیاہ باب ہے۔ اس عظیم سانحے کو بڑے تخلیق کار موضوع نہیں بنا سکے البتہ کہیں کہیں ان کی تحریروں میں اس سانحے کی عکاسی ملتی ہے۔ البتہ یہ تاثر درست نہیں کہ اس سانحے کی ناول میں بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان کو براہ راست موضوع بنانے والے ناولوں میں ''اللہ میگھ دے'' از طارق محمود اور ''صدیوں کی زنجیر'' از رضیہ فصیح احمد قدرے قابل ذکر ناول ہیں۔ دیگر ناولوں میں سلمیٰ اعوان اور جیون خان کے ناول بالترتیب ''تنہا'' اور ''دیپتی'' کا انداز وقائع نگار کا سا ہے۔ جیون خان کی ٹھوس منطقیت ناول کا حسن کا گہنا دیتی ہے تو سلمیٰ اعوان کا نسائی جذباتی لہجہ ناول سے زیادہ ماجرے کے بیان کو مرکز بنا لیتا ہے۔ البتہ کرب اور درد کی ٹیس دونوں ناول نگاروں نے نہ صرف خود محسوس کی ہے بلکہ قاری کو بھی شامل کیا ہے۔

انتظار حسین کا ناول ''بستی'' کا بنیادی موضوع تو اپنی زمین سے بچھڑنے اور اپنی تہذیب و ثقافت کے نابود ہونے کا کرب ہے البتہ پاکستان کے حالات و مسائل بھی اس کا موضوع بنتے ہیں یوں ۱۹۷۱ء کا دلخراش سانحہ بھی ان کے ناول کا حصہ بن جاتا ہے، جسے انتظار حسین کے داستانوی اسلوب نے مزید کرب انگیز بنا دیا ہے۔ ''بستی'' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس المیے کے ملک کے مغربی حصے کے عام افراد پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے کیونکہ اخبارات پر سخت صحافتی پابندیوں کے باعث مغربی حصے کے لوگ مشرقی حصے میں ہونے والے واقعات سے مکمل طور پر بے خبر تھے اور جب انھیں اچانک اس سانحے کی خبر ملی تو وہ ''اجتماعی سکتے'' میں چلے گئے:

''مولانا صاحب! یہ کیا ہو گیا؟''

ابا جان نے خواجہ صاحب کے رقت بھرے سوال کا جواب خشک سے لہجے میں دیا:

''خواجہ صاحب! یہ دنیا دارالحساب ہے۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔''

پھر خاموشی سے حقہ پینے لگے۔

خواجہ صاحب چپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے:

''مولانا صاحب: جب میں ریڈیو سن رہا تھا تو جی چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کے روؤں مگر میں بوڑھا آدمی، جوان اولاد کے سامنے روتا کیا اچھا لگتا تھا؟ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ آخر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا اور صحن میں درخت کے نیچے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ سب کمرے میں بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے۔ بس بند ٹوٹ گیا۔'' (بستی، ص۱۹۰)

جس نفرت اور حقارت کا اظہار ''آگ کا دریا'' میں بنگالیوں کے لیے دیکھنے کو ملتا ہے ویسا ہی اظہار ''بستی'' میں بھی نظر آتا ہے۔ فقط امتیاز یہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' میں اس نفرت کا اظہار مشرقی پاکستان میں تعینات مغربی پاکستان کے اعلیٰ افسر کر رہے تھے جبکہ ویسی ہی حقارت کا اظہار مغربی پاکستان کے عام افراد ''بستی'' میں کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا پاکستانی مقتدر قوتوں نے مغربی حصے کی عوام کو باور کرا دیا تھا کہ مشرقی حصہ میں بنگالی بلا وجہ بغاوت کر رہے ہیں اور اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج کشی اور طاقت کے استعمال کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا:

''یار میرا بھائی رات ہی کی فلائٹ سے آیا ہے۔''

''اچھا؟''

''ایکشن شروع ہونے کے بعد چلا ہے۔''

''بس اسی وقت شروع ہوا تھا۔ کہتا ہے کہ۔۔۔ جب ہمارے جہاز نے ٹیک آف کیا اور ہم نے باہر کی طرف دیکھا تو دور تک دھواں ہی دھواں تھا۔''

''اچھا؟'' ''مگر ہو گا کیا؟''

''آگے جو کچھ بھی ہو۔ سالے بنگالیوں کے تو دھوئیں اُڑ گئے۔''

''حرامزادے۔'' منہ ہی منہ میں غصے میں کوئی بڑبڑایا۔''

''اب طبعیت صاف ہو جائے گی۔''

مسرت، بیزاری، نفرت، غصہ ہر صورت اظہار سرگوشیوں میں ہو رہا تھا۔'' (بستی، ص۸۴)

''بستی'' ان کھوئے ہوئے افراد کی داستان ہے جن کی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ شناخت کا یہ بحران اس وقت شدت اختیار کر گیا جب سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ رونما ہوا۔ پاکستان کے تہذیبی بحران اور ''بستی'' کے بیانیے کا جائزہ لیتے ہوئے مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

> انتظار حسین کا ناول ''بستی'' مشرقی اور مغربی پاکستان کے نوجوانوں، دانشوروں، انقلاب پسندوں، مذہب پرستوں، شاعرانہ ذہن کے مالکوں اور فن کاروں کی ذہنی بے سمتی اور کوفتوں کو عیاں کرتا ہے۔۔۔قیام پاکستان کے بعد ۱۹۷۱ء تک پاکستانی معاشرہ جس بحران اور سیاسی اتھل پتھل کا شکار رہا، اس کی منظر کشی۔۔۔ خاص طور سے ۱۹۶۸ء سے لے کر ۱۹۷۱ء تک بحرانی حالت کی جو بھر پور اور متاثر کن عکاسی مذکورہ ناول کے ذریعے کی گئی ہے اس کی مثال کسی دوسرے ناول میں ملنا ناممکن ہے۔[۶]

مشرقی پاکستان کے سانحہ اور جنگ کی شکست کے بعد پاکستانی سماج مجموعی خوف زدگی کا شکار ہو چکا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا تھا کہ کچھ بیرونی عوامل ملک توڑنا چاہتے ہیں اور غدار بنگالی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ وہ نظریہ تھا جسے حکومت اور فوجی ٹولے نے عوام کو سمجھا رکھا تھا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ قیام پاکستان نے ایک مسلم پاکستانی قومیت کا تصور ابھارا تھا اور خطے کے عوام درست طور پر باور کر بیٹھے کہ وہ اپنی تقدیر کے اب خود مالک ہوں گے مگر روایتی نو آبادیاتی تربیت یافتہ اشرافیہ نے ایسے خوابوں کو تعبیر کی صورت نہ دیکھنے دی۔ مخصوص فوجی مزاج نے عوام کو ہر عہد میں حقائق سے بے خبر رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور جب سانحہ رونما ہو گیا تو ذمہ داری لینے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ فوج نے تمام ملبہ حسب معمول سول حکومت پہ ڈال دیا البتہ جھنجھلاہٹ، بے بسی اے معنویت، چڑچڑا پن عام افراد تک سرایت کر گیا:

''تم لوگ ہو اس شکست کے ذمہ دار۔''

دونوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

''عرفان! میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم ہو اس شکست کے ذمہ دار اور ذاکر تم۔''

''کیسے؟'' اس نے سادگی سے پوچھا

سلامت نے لال پیلے ہو کر کہا:

> ''تم سامراج کے پٹھو، تم بھولے بن کر پوچھتے ہو کیسے؟ سوچو کہ تم لڑکوں کو کیا پڑھاتے ہو؟ بادشاہوں کی تاریخ۔ افیون کی گولیاں۔ ہاں اور تمہارا باپ ذمہ دار ہے جو میرے باپ کو روز مذہب کی افیون کی ایک گولی کھلا دیتا ہے۔'' (بستی، ص۱۹۵)

اس جھنجھلاہٹ نے عام لوگوں میں غصہ بھر دیا اور وہ ایک دوسرے کے گریبان پکڑنے لگے:

''سلامت صاحب! میں نے آپ کی پارٹی کے جلسے میں آپ کی تقریر سنی تھی۔ جو آپ نے بنگلہ دیش کی حمایت میں کی تھی۔ آپ آج کس بات پر افسوس کر رہے ہیں؟''

''افسوس۔'' سلامت نے غصے سے کہا۔''افسوس کیسا؟ میں سامراجی دلّوں کوخبردار کر رہا ہوں کہ تم بازی ہار چکے ہو۔''

''یعنی پاکستان بازی ہار چکا ہے؟ یہی کہنا چاہتے ہو؟'' نوجوان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔''(بستی،ص۱۹۵)

سقوطِ مشرقی پاکستان کے حوالے سے انتظار حسین کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد اشرف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

اس طرح جھنجھلاہٹ اجتماعی فرسٹریشن کا علامیہ ہے کہ جب قومیں خارجی قوتوں سے نبرد آزما ہونے میں ناکام رہتی ہیں تو وہ داخلی اور مقامی سطح پر باہمی منافرت اور داخلی آویزش کا شکار ہوتی ہیں۔[۷]

مشرقی پاکستان کا احساس محرومی کئی اطراف کا حامل تھا۔لیکن اس میں زیادہ شدت اقتصادی ناہمواری اور سیاسی حالات نے پیدا کر دی تھی۔قومیت کی شناخت اور اردو بطور سرکاری زبان کی آمریت نے بھی بنگلہ عوام کو اپنی زبان اور ثقافت کے بارے میں حساس بنا دیا۔مزید ستم یہ کہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں مشرقی پاکستان کے دفاع کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جس سے بنگلہ عوام میں شدید عدم تحفظ نے بھی جنم لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ فوج نے اس نظریئے کو فروغ دیا کہ مشرقی پاکستان کا دفاعی مغربی پاکستان سے کیا جائے گا تو اس نظریئے نے مغربی پاکستان کی اہمیت کو بڑھا دیا اور وسائل کا رخ بھی مغربی حصہ کی طرف ہو گیا کیوں کہ افواج پاکستان کا بڑا حصہ مغربی حصہ میں مقیم تھا۔اس طرح احساس محرومی اور یہ احساس بھی کہ وسائل کے منصفانہ استعمال اور افواج پاکستان کی ضروریات پوری کرنے کے نام پر بنگلہ عوام کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہونے دی جائے گی، شدید ہو گیا۔قیام پاکستان کے بعد اہل بنگال کا خیال تھا کہ استحصالی قوتوں کے ملک سے رخصت ہونے کے بعد ان کی اقتصادی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن جب نئی حکومت نے بھی ایسے اقدامات نہ کیے بلکہ سرمائے کا رخ مرکز کی طرف مرتکز رکھا اور افواج کا بڑا حصہ مغربی پاکستان میں ہونے کے باعث ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی سرمایہ بنگال سے مرکز کو منتقل ہونے لگا تو بنگالیوں میں یہ شدید احساس پیدا ہوا کہ ان کی تمام تر دولت پر مغربی پاکستان کا قبضہ ہے فقط زنجیر بدلی ہے طرز حکمرانی میں کوئی بڑا فرق پیدا نہیں ہوا۔تمام ناول نگاروں نے بنگال کی غربت و کسمپرسی کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔مثلاً ''اللہ میگھ دے'' میں ابوالقاسم بین السطور یہ بات سمجھتا ہے کہ مشرقی حصے کی ترقی نہ ہونے کا سبب مغربی حصے کی بالادستی ہے:

''۔۔۔مشرقی حصہ کو مغربی پاکستان کے برابر لانے کے لیے اب تو شعوری کوششیں کی جا رہی ہیں۔صورت حال اس قدر دگر گوں بھی نہیں۔''

''کیسی کوششیں'' ابوالقاسم بلند آواز ہوئے۔

''تیسرے پنج سالہ میں اس بات کا مداوا کیا جا رہا ہے۔مغربی پاکستان میں اصل بریک تھرو نجی شعبہ کی بنا پر ہوا ہے۔ اس بار اسی شعبے کو دونوں صوبوں میں یکساں اہمیت دی جا رہی ہے۔''

''تم کیسی باتوں میں پڑ گئے ہو'' ابوالقاسم گرج کر بولا۔'' یہی سوچ کا المیہ ہے۔ اگر یہ بات درست بھی تسلیم کر لی جائے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجی شعبہ کیا ویسا ہی رول یہاں ادا کر پائے گا۔ کیا اسے انفراسٹرکچرل بیس(Infrastructural Base) میسر ہو گی جو اسے مغربی پاکستان میں میسر ہے۔ اور پھر اگر یہ بنیاد فراہم کر بھی دی جائے جو بظاہر ناممکنات میں سے ہے تو دیکھنا ہو گا کہ نجی شعبہ پر کن لوگوں کی اجارہ داری ہے؟''(اللہ میگھ دے،ص۱۷۱)

گویا مغربی حصے پر قابض فوجی حکومت جسے مساوی اقتصادی ترقی اور قابل عمل حل قرار دے رہی تھی اسے بنگال کا باشعور طبقہ رد کر رہا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں اول اقتصادی ترقی بالخصوص پسماندہ علاقوں میں، کی بنیاد ریاست قائم کرتی ہے اور اگر ریاست نجی شعبے کو شریک کار کرنا بھی چاہے تو یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ریاست بنیادی نوعیت کی سہولیات وہاں پہنچا چکی ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہی تھی جو اقتباس میں بیان ہوئی کہ بنیادی سہولیات کے فقدان کے باعث کیسے ممکن ہے کہ نجی شعبہ ترقیاتی کام کرے گا۔

بنگال کا یہ شعور محض اقتصادیات تک محدود نہ تھا بلکہ ان کا سیاسی وتہذیبی شعور بھی ملک کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت ارفع تھا اور اسے سمجھنے میں مغربی حصے کی سیاسی اشرافیہ نے غلطی کی۔ اقتصادی شعور نے جس ہیجان اور محرومی کا احساس دلایا اسے سیاسی شعور نے مہمیز لگا دی اور بنگال کو یہ احساس شدید ہونے لگا کہ انھیں سیاسی عمل سے دانستہ باہر رکھا جا رہا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فوجی استبداد کے خلاف مزاحمت بھی بنگال نے ہی کی تھی۔ بنگالیوں میں یہ احساس شدید تھا کہ جمہوریت پر اس لیے شب خون مارا جا رہا ہے کہ بنگال اکثریتی خطہ ہے اور قوم پرستی کی یہ لہر دیگر پاکستانی قوموں کو بھی ان کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ یہاں یہ سوال شدت سے پیدا ہوتا ہے وہ بنگال جس نے برصغیر کے مسلم سیاسی شعور کو بیدار کیا اور تحریک پاکستان کے ہراول دستے کے طور پر نمایاں رہا اسے غدار کیوں قرار دیا جا رہا تھا؟ بنگال کے پس منظر میں لکھے گئے ناول اس سوال کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور اگر سوال اٹھاتے بھی ہیں تو اس کا شافی جواب نہیں دے پاتے:

> قیام پاکستان کے بعد ملکی سیاست میں بنگال کا کردار محض عضو معطل بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارا پہلا ردعمل جگتو فرنٹ کی کامیابی کی صورت میں تھا۔ ایک نیشنل فریم ورک میں ہم نے اس کامیابی میں Autonomous decision Centres کی راہ نکالی تھی۔ یہ تو یہاں کی رائے عامہ کا فیصلہ تھا۔ ایسا فیصلہ جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔۔۔لیکن Invisible Hand اپنا کام دکھا گیا۔ ہمارا پاور سٹرکچر ہر دور میں ایک نئے روپ کے ساتھ سامنے آتا ہے۔۔۔ میری دانست میں یہ پاور سٹرکچر بنگالیوں کی اکثریت اور اس کے مضمرات کو کبھی بھی ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے گا۔ پاکستان کی تاریخ اس بات کی غمازی کرتی ہے اور شاید یہی ہمارا مستقبل ہو۔ اس حوالے سے بنگالیوں کی قوت فیصلہ کو شک کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔(اللہ میگھ دے، ص۲۳)

بنگال میں یہی سیاسی محرومی جڑ پکڑ رہی تھی کہ ان کی سیاسی حیثیت اس بنا پر تسلیم نہیں کی جا رہی کہ وہ ریاستی مقتدر قوتوں کے نظریہ وطن پرستی سے مختلف سوچتے ہیں۔ یہی صورتحال ''صدیوں کی زنجیر'' میں بھی نظر آتی ہے:

> ''سوال تو یہ ہے کہ جب پاکستان بنگالیوں کی مرضی اور حمایت سے بنا تھا تو وہی اس کو توڑنے پر تیار کیسے ہوئے؟''
>
> ''اس طرح کہ انھیں یہ احساس ہوایا دلایا گیا کہ پہلے انھیں ہندوؤں نے کچلا پھر انگریزوں نے جی بھر کر دبایا۔ پاکستان بننے کے بعد اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کرنے کا حق ان کا تھا۔ آپ نے وہ حق انھیں نہیں دیا تو انھوں نے دوسرا حق استعمال کیا۔'' (صدیوں کی زنجیر، ص۱۳۹)

سلمی اعوان کا ناول ''تنہا'' کا کردار بھی متحدہ پاکستان کے بائیس سالہ دور میں بنگال میں کی جانے والی زیادتیوں اور زبردستیوں اور بنگالیوں کی آواز دبانے کی سازشوں کے خلاف ردعمل کرتے ہوئے کہتا ہے:

> بائیس سالوں نے ہمیں کیا دیا۔ اقتصادی بدحالی، سیاسی حق سے محرومی، فوجی آمریت کے شکنجے، نوکر شاہی، اب بھی آپ کہتی ہیں سومی آپا کہ حقائق پر جذبات غالب آ گئے ہیں۔ یہاں تو حقائق اتنے کڑوے ہیں کہ زندگی تلخ ہو کر رہ

گئی ہے۔(تنہا،ص۱۴۸)

متحدہ پاکستان کے بائیس سالہ دور میں بنگال کی سیاسی آواز کو ہی نہ سنا گیا بلکہ بیرونی دنیا سے کیے جانے والے تجارتی، سفارتی اور تہذیبی معاہدوں میں بھی بنیادی زاویہ ملک کے مغربی حصے کو بنایا گیا۔جس سے بنگال میں پاکستان سے اجنبیت کی فضا کو مزید ہوا ملی۔مثلاً ایوب خان کے آمرانہ دور میں RCD کا ایران اور ترکی کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ گو کہ ایک اچھا عمل تھا لیکن بنگال میں اسے مختلف زاویہ نظر سے دیکھا گیا:

> اس تنظیم کا بھلا مشرقی پاکستان کو کیا فائدہ! آخر پاکستان سے مراد محض مغربی پاکستان ہی تو نہیں۔ ہر چیز کو وہاں کے اینگل سے دیکھا جائے۔تجارت،منصوبہ بندی، دفاع اور دفاعی حکمت عملی اور پھر یہ سب کچھ پاکستان کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ایسا پاکستان جہاںPolicy Decisions میں ہمیں کوئی بھی نہیں پوچھتا۔میرے خیال میں کسی کو اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔۔آخر کار آر سی ڈی کا ہمارے اس خطہ کو کیا فائدہ؟(اللہ میگھ دے،ص۲۱۹)

سقوط مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے ناول واقعات کے بیان پر اور ان واقعات کے منطقی استدلال پر زیادہ زور دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں کہانی پن کا عنصر ختم نہ بھی ہو تو کم ضرور ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر بشیر منصور ان ناولوں کی واقعات نگاری کے متعلق لکھتے ہیں ''سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھے گئے ناول جہاں اس المیے کے باعث بننے والے اسباب بیان کرتے نظر آتے ہیں وہاں ان ناولوں میں ہمیں بحران کے دنوں کی پوری تاریخ بھی نظر آتی ہے۔''[۸] یہی ان ناولوں کی خامی بھی ہے کہ تاریخ کا بیان زیادہ ہے اور تاریخ ماجرا میں آمیخت ہو کر نہیں آئی بلکہ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ محض ان تاریخی واقعات کو بیان کرنے کے لیے کہانی کا سہارا لیا گیا ہے۔مثلاً ''صدیوں کی زنجیر'' اور ''تنہا'' میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں کرداروں کا عمل کہانی کے ارتقا میں اور بعض جگہ واقعات کا پھیلاؤ کہانی کی دلچسپی میں کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ایسی ہی ''اللہ میگھ دے'' کی بھی صورت حال ہے۔مصنف کمزور استدلال کے ساتھ مشرقی حصہ کے نقطہ نظر کو پیش کرنا چاہتا ہے مگر وہ نقطہ نظر ریاستی پالیسی خطوط کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے۔کہانی اور ناول کے ارتقا کے ساتھ دیگر مسائل وہی رہیں جو اس پس منظر میں لکھے گئے دیگر ناولوں کے ساتھ ہیں۔

تہذیبی تفاوت بھی ملک کے دونوں حصوں میں دوری کا باعث بنا۔ پاکستان کا قیام دراصل اسلامی فکریات کا مظہر تھا لیکن پاکستان کے کلیدی نظریہ ساز محمد علی جناح کی بے وقت موت اور اقتدار پر براجمان نو آبادیاتی اشرافیہ نے آئین سازی میں جو تاخیر کر دی اس نے کثیر لسانی ملک میں کئی طرح کے مسائل کو جنم دیا۔سب سے اہم مسئلہ ملک کی ایک زبان کے حوالے سے درپیش تھا۔ اقتدار پر براجمان اشرافیہ میں سے بیشتر کا تعلق وسطی ہند تہذیبی خطوں سے تھا اور وہ اپنے ساتھ ایک ترقی یافتہ زبان بھی لائے۔ وہ زبان اردو تھی جو پاکستانی علاقوں میں بولی اور سمجھی تو جا رہی تھی لیکن وہ ان علاقوں کی مقامی زبان نہیں تھی۔ اسی طرح ثقافتی وتہذیبی برتری کے احساس نے بھی دوریوں کو جنم دیا جیسا کہ قبل ازیں آئین ٹالبوٹ کے مندرج اقتباس میں وضاحت کی گئی ہے۔ بنگالی البتہ اردو سے معمولی ربط بھی نہ رکھتے تھے اور ان کی اپنی زبان کا ورثہ صدیوں پرانا تھا سو وہ نئی زبان قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کا پہلا ردِعمل خود محمد علی جناح کی موجودگی میں ڈھاکہ میں دیکھنے میں آیا۔مغربی پاکستان کے خطوں میں سندھ میں بھی یہی ردِعمل پیدا ہوا البتہ بنگال کا احتجاج شدید تھا اور اس کی وجہ بھی تھی کیونکہ بنگالی عوام اردو سے نابلد تھی بلکہ اردو ان کے لیے بالکل اجنبی زبان تھی:

> آزادی کے بعد جب روزمرہ کے معاملات نے سر اُٹھانا شروع کیا تو اہل بنگال کے لیے زبان کا مسئلہ سرفہرست تھا۔

بنگالی زبان پانچ کروڑ مسلمانوں کا ایسا ثقافتی ورثہ تھا جو ان کے معاشرتی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔۔۔ اس کا خمیر یہاں کے سبزہ زاروں، دریاؤں کی لہروں سے اٹھا۔ اس میں دھان کی خوشبو اور مچھلی کی باس بھی تھی۔ یہی زبان مسلم شعور اور مسلم تشخص کی علامت بنی۔(اللہ میگھ دے، ص۱۸۰)

البتہ مصنف ''اللہ میگھ دے'' کا واحد متکلم ''میں'' یعنی ''عمر'' ہر موقع پر اپنے مخاطب کو طفل تسلیاں دیتا نظر آتا ہے۔ وہ حالات کا درست تجزیہ کرنا نہیں چاہتا اسی لیے زبان کا معاملہ ہو یا دیگر سیاسی، ثقافتی، اقتصادی مباحث ہوں مصنف کے واحد متکلم کا پیدا کردہ استدلال کمزور ہوتا ہے۔ یہاں زبان کے معاملے پر بھی اس کا استدلال کمزور رہا:

''تم نے بنگلہ کو صوبائی زبان دینے کا مطالبہ کیا تھا لیکن اب تو وہ قومی زبان بن چکی ہے۔'' میں نے توجیح پیش کی۔

''کس قیمت پر۔'' فضلو بولا

''درست فیصلہ وہی ہوتا ہے جو صحیح وقت پر کیا جائے۔'' (اللہ میگھ دے، ص۱۸۱)

ناول کا واحد متکلم توجیح سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ ڈاکٹر خالد اشرف ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والے اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

ناول کافی کمزور ہے۔ کیونکہ یہاں فن کے نام پر پاکستانی حکومت کے View Point کو ہی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف مشرقی پاکستان کی پسماندگی، معاشی بدحالی اور مغربی پاکستان کے افسران اور سرمایہ داروں کے ذریعہ کیے جانے والے ظلم و استحصال کو محسوس کرتا ہے لیکن وہ اس سارے عمل کے پس پشت موجود مختلف سیاسی و معاشی عوامل کا تجزیہ نہیں کر پاتا یا شاید کرنا نہیں چاہتا۔ ناول میں کہیں کہیں بنگلہ دیش کے باشندوں کے سیاسی شعور۔۔۔ بنگالی نوجوانوں کے دلوں اور ذہنوں میں پلنے اور پھیلنے والی شدید نفرت کی عکاسی کی گئی ہے۔[۹]

مشرقی حصے میں آزادی کے وقت ہجرت کر کے جانے والوں کی بڑی تعداد بہاریوں پر مشتمل تھی۔ وہاں انھوں نے اپنی الگ آبادی تشکیل دی ان افراد میں بھی تہذیبی برتری اور لسانی برتری کا احساس موجود تھا اس لیے مقامی آبادی کے ساتھ ان کا ربط یا میل جول نہ بڑھ سکا۔ مثلاً ''اللہ میگھ دے'' کے کردار بہاریوں کے مسئلے پر یوں گفتگو کرتے ہیں:

یار ان بہاریوں کو یہاں آباد ہوئے لگ بھگ بیس برس سے زائد عرصہ ہو چکا ہے اور آج بھی محمد پور اور میر پور جیسے جزیروں میں رہ رہے ہیں'' فضلو نے تنگ کر کہا

''فضلو۔ محمد پور اور میر پور ممکن ہے ہم میں سے کئی پیٹی مائنڈڈ بنگالیوں کی سوچ کا منطقی نتیجہ ہو'' قیوم بولا

''یار تم پھر فلسفہ بگھارنے لگے ہو۔ بیس اکیس برس کا عرصہ کیا کم ہوتا ہے۔''

فضلو ہار ماننے والا کہاں تھا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں Cultural Assimilation اتنی آسان بات نہیں۔ اور پھر اردو سپیکنگ آبادی کا ایک مضبوط ثقافتی پس منظر بھی ہے۔ انہیں یہاں کی ثقافت سے مربوط ہونے کو ایک وقت درکار ہے۔ یہ سب کچھ تو ایک تدریجی عمل کے ذریعے ممکن ہے۔'' (اللہ میگھ دے، ص۱۸۹)

اسی لسانی وثقافتی برتری نے انھیں بے جڑ رکھا اور پناہ گزین کیمپوں میں موجود یہ بہاری آج بھی عسرت کی زندگی گزار رہے

ہیں۔ ناول کی مجموعی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر اے بی اشرف لکھتے ہیں:

> طارق محمود نے اس المیے کے اسباب کے تجزیے میں سب سے زیادہ اہمیت سیاسی اور معاشی عوامل کو دی ہے۔ اس لیے ایک لحاظ سے ''اللہ میگھ دے'' کو سیاسی ناول کہنا بے جانہ ہوگا کیونکہ جا بجا سیاسی بحثیں اور اقتصادی وجوہ پر گفتگو موجود ہے۔ ان بحثوں میں مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کا الگ الگ نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ مفاہمت کی راہ نکل نہ سکی اور اس لیے مختلف خارجی اور داخلی اسباب نے اس المیے کو جنم دیا۔لیکن ناول میں دلچسپی کا سبب سیاسی مباحث نہیں وہ حصے ہیں جن میں بنگال کی مفلوک الحالی، معاشرت کا حقیقی تناظر، معمولی معمولی اَن پڑھ لوگوں کا سیاسی اور طبقاتی شعور، لوگوں کی عاجزی اور خلوص، خوبصورت مناظر کے پیچھے جھانکتی ہوئی غربت اور استحصال کے ہولناک نقشے پیش کیے گئے ہیں۔[10]

الطاف فاطمہ کا ناول ''چلتا مسافر'' بھی سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔الطاف فاطمہ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر احسان اکبر لکھتے ہیں:

> الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو'' محض کرداری تضادات ہی کو روبرو لاتا ہے۔ان کا نیا ناول '' چلتا مسافر'' بھی معاشرتی سطح سے ابھر کر کرداری مطالعات ہی تک آتا ہے اور بڑا قضیہ ان کے سامنے نہیں آتا۔[11]

حالانکہ مصنفہ کے سامنے سانحہ مشرقی پاکستان کا بڑا قضیہ موجود ہے لیکن وہ ان کی تخلیقی گرفت میں نہیں آسکا۔ اس لیے ناول کا ماجرائی بیانیہ کمزور ہے، واقعات پر انحصار زیادہ کیا گیا ہے۔ قصہ کے بیان میں مصنفہ کے نسائی جذبات کی اثر پذیری موجود ہے۔ ڈاکٹر بشیر احمد ناول کی کہانی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بہاریوں کے مسئلے پر لکھا گیا یہ واحد مکمل ناول ہے جس میں ناول نگار نے اس مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے ایک ایسے گھرانے کا انتخاب کیا ہے جو ۱۹۴۷ء میں بھارت سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہو جاتا ہے مگر تھوڑے ہی عرصے میں حالات ایسا رخ اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے ایک بار پھر ہجرت کے اسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔[12]

۱۹۷۱ء کے شورش زدہ حالات میں ان بہاریوں نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ ان کے المیے کو بھی کسی ناول نگار نے موضوع نہیں بنایا۔ فقط ''چلتا مسافر'' میں یہ المیہ موضوع بنا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مزمل اور اس کے والد مسلم لیگ کے شیدائی ہیں۔ بہار کا یہ سید خاندان ہجرت کر کے ڈھاکہ آن بستا ہے لیکن ۱۹۷۱ء ان کے لیے دوبارہ المیے لے آتا ہے۔ ناول کے مرکزی کرداروں میں سلسبیل اور بُذل الرّحمن کے مابین محبت دونوں خطوں میں موجود نسلی اور لسانی اختلافات کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ سلسبیل کا خاندان یہ سمجھتا ہے کہ ان کی نسل برتر ہے اور ان کی ثقافتی اقدار بنگالی ثقافت سے زیادہ نمایاں اور اہم ہیں۔ ناول کی کہانی اور ماجرے کی جزئیات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نجمہ صدیق لکھتی ہیں:

> اس کے (ناول کے) واقعات میں بھی ربط وضبط اور ہم آہنگی ہے اور ساتھ ساتھ درد وغم کی ایک لہر ہے جو اس کہانی کی گہرائی اور اس کے غم ناک پہلوؤں کو اثر انگیز طریقے سے ابھارتی ہے۔ اس ناول کا کینوس وسیع ہے اور زمانی اعتبار سے یہ ناول تقسیم ہند سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع بہاریوں کا المیہ ہے۔[13]

۱۹۷۱ء کے الم انگیز واقعات نے بہت بڑے انسانی المیے کو جنم دیا۔ انسانی قتل اور خواتین کی آبروریزی اور پھر ان کا قتل

معمول کے واقعات ہو چکے تھے۔ ایسے ہی ایک قتل عام کا منظر الطاف فاطمہ بیان کرتی ہیں:

> قبرستان جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ قبرستان تو پھیل کر گلی محلوں تک آ گیا تھا جس طرف جا نکلو دس پانچ دھڑ کتے ہوئے بے شمارے اعضا اور ننھے ننھے بچوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ پھر چند لوگ کھرپالیں اور بیلچے لئے آتے بڑے بڑے گڑھے کھود کر مشترکہ قبریں بنا دیتے۔ کبھی دو کبھی تین آدمی صف بستہ ہو کر ان بے گور و کفن لاشوں کے جنازوں کی نمازیں بھی پڑھ لیتے۔ (چلتا مسافر، ص ۳۱۱)

بنگال میں ہونے والی خانہ جنگی کا احوال ''اللہ میگھ دے'' میں کم ہے البتہ ''صدیوں کی زنجیر'' اور ''تنہا'' میں قدرے تفصیل سے ہے لیکن جذباتیت، کمزور بیانیہ، واقعات پر انحصار اور غیر جانبداری کے فقدان کے باعث صورتحال محض کرب انگیز تو ہو گئی لیکن وہ کسی فکری منہاج کو پیدا نہیں کر سکی۔ سقوط ڈھاکہ نے جس فکری انتشار کو جنم دیا وہ عدم شناخت کے بحران کے احساس کے ساتھ افسانے اور شاعری میں تو بار آور تخلیقی اظہار پا سکا لیکن بحیثیت مجموعی اردو ناول میں اتنا بڑا تخلیقی اظہار نمود نہ کر سکا۔ ڈاکٹر روبینہ شہناز نے اس ہزیمت اور پراگندہ خیالی سے باقی ماندہ پاکستان کی تخلیقی فنکاروں کے لیے امید کی کرن تلاش کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> سقوط ڈھاکہ نے ہزیمت پیدا کی ۔ شکست کا شدید احساس اور اس سے زیادہ شناخت کا بحران ایسے مسائل تھے جنھوں نے ہمارے ادب میں مایوسی، غصہ، جھنجھلاہٹ، تلخی اور دیگر نفسیاتی مسائل پیدا کیے۔ ان سب مسائل میں صرف ایک ہی امید کی کرن باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ آمریت کا وقتی خاتمہ ، مارشل لاؤں کی جگہ جمہوریت نے حاصل کر لی تھی۔ آزادی اظہار نے شاعروں اور ادیبوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی بات کو برملا کہہ سکیں لیکن قومی سطح پر یہ کیفیت بہت دیر برقرار نہ رہی۔[۱۴]

سانحہ مشرقی پاکستان کی بازگشت معدودے چند اردو ناولوں میں سننے کو مل جاتی ہے۔ ''راکھ'' سے قبل ''خوشیوں کا باغ'' میں بھی اس سانحے سے پیدا ہونے والے اضطراب اور اس کے وقوع پذیر ہونے والے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اسباب کا علم ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان میں خود کو سماجی و تہذیبی سطح پر بنگالیوں سے برتر سمجھنے کا شدید رویہ موجود تھا۔ اس سماجی، نسلی اور تہذیبی تفاخر کو ایوب خان کی آمریت نے فروغ دیا۔ بنگال کے بیدار سیاسی شعور نے ایوبی آمریت کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا سو مغربی پاکستان کی اشرافیہ نے بنگالیوں سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔ جاوید قاضی اپنی ترجمہ کتاب ''پاکستان میں امریکی کردار'' میں لکھتے ہیں:

> مغربی پاکستان کے عوام ہر فاتح نسل کے آثار کے حامل ہیں۔ مشرقی پاکستان کو اپنی پوری تاریخ میں حقیقی آزادی یا خودمختاری کا کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے ثقافتی اور لسانی اثر کے تحت بہت رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ پسی ہوئی نسلوں کے تمام دبے ہوئے جذبوں کے حامل ہونے کے سبب ابھی تک وہ خود کو ملنے والی آزادی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں کر سکے۔[۱۵]

''خوشیوں کا باغ'' ناول میں بھی اس المیے کی بازگشت موجود رہے۔ دراصل اس ناول میں کہانی یا قصے سے زیادہ وقوعے کو اہم گردانا گیا ہے اس لیے ناول میں بیانات بہت زیادہ ہیں۔ مصنف کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ان بیانات کے ذریعے ماجرے میں اثر انگیزی پیدا کر لیتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں عوام کے کیے جانے والے استحصال کو مجمع باز کی تقریر کے ذریعے مصنف نے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> وہ کہتے ہیں کہ یہ ملک انھوں نے بنایا اپنی اکثریت کی بنا پر تو کیا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ نے وہاں پر بہت ظلم کیے

ہیں۔فوج اپنے ہی بھائی بندوں کو گولیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے، اگر سچ بھی ہے تو کیا ہوا۔ اس سے ایک تو آبادی کا مسئلہ حل ہو گا کہ آپ ایک منٹ میں چھ ہزار روپے پیدا کرتے ہیں تو وہ ادھر ایک منٹ میں آٹھ ہزار بچے پیدا کر لیتے ہیں۔ ہنھ! اور دوسرے اس اوپریشن سے خوراک کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اب کوئی ان سے پوچھے، بھائی سائیکلون ہم یہاں بھیجتے ہیں، یہ تو عذاب الٰہی ہے جو تمہارے گناہوں کا عذاب ہے کہ تم سب بیٹھے ہوئے بھائیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بند وغیرہ باندھ کر سائیکلونوں کی تباہی سے آبادیاں بچائی جا سکتی ہیں۔ لو، اور سنو قہر الٰہی کے سامنے کون بند باندھ سکتا ہے۔ تو صاحبان یہ سب دشمنوں، غداروں، ملحدوں کی سازش ہے۔ (خوشیوں کا باغ، ص۸۱)

اردو ادب میں اس سانحہ کا تخلیقی اظہار شاعری اور افسانے میں زیادہ بہتر ہوا ناول میں یہ سانحہ کم موضوع بنا ہے۔اس عظیم سانحہ کی بازگشت مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' میں بھی سنی گئی، ''راکھ'' میں تاریخ اور عصر باہم آمیخت ہو کر آئے ہیں۔ کردار جب اپنے ماضی میں جاتے ہیں تو وہ ۴۷ء اور ۷۱ء کے خونچکاں واقعات یاد کرتے ہیں اور پھر یہی کردار تاریخ کے تہذیبی سفر کی باز گشت بھی بن جاتے ہیں۔ مردان ۷۱ء میں بنگال میں تعینات تھا۔حال کے منظر نامے میں اس کے ذہن پر ۷۱ء کے عکس جھلملاتے ہیں تو وہ زندگی کے ہجوم میں خود کو گم کر دینا چاہتا ہے:

''مکتی باہنی سر۔'' صوبیدار اللہ یار نے شن ہو کر کہا۔

''آر یو شیور؟'' مردان نے پوچھا۔

''آہو جی۔ان مردودوں کی شکل سے پتہ چل جاتا ہے۔شوٹ کردوں سر۔۔۔''

''چیک کر لو یار۔'' (راکھ، ص۱۵۵)

اس دوران جس ہتک آمیز طریقے سے ان بنگالیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے یقیناً وہ عام بنگالی کے غصہ میں اضافہ کرنے کے لیے کافی تھا۔فوجی استبداد عوام کے ساتھ ہر جگہ یہی سلوک کرتا ہے۔مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا تعصب محض انھیں غدار سمجھنے تک محدود نہیں بلکہ مغربی حصہ کے عام طبقات بھی انھیں خود سے کمتر سمجھتے تھے۔ یہ تعصب ان کی تہذیب، زبان اور معاشرت تک پھیلا ہوا تھا:

''ان باسٹرڈز سے پوچھو یار کہ کیا ہیں۔۔۔''

''یہ ماں یائے نہ اردو بولتے ہیں سر۔۔۔ ہماری قومی زبان اور۔۔۔ پتہ نہیں کیا بولتے ہیں۔۔۔لیکن سر کلمہ پڑھتے ہیں بار بار۔''

''کلمہ تو ادھر سارے ہندو بھی پڑھ سکتے ہیں سَر۔'' ایک لیفٹیننٹ نے اپنا تجربہ بیان کیا ''دے آر مکتی باہنی سر۔''

''شوٹ دیم۔'' (راکھ، ص۱۵۵)

مصنف کا منشا یہ دکھانا ہے کہ ان سانحوں سے نہ تو اشرافیہ نے کچھ سیکھا اور نہ ہی عوام یوم حساب برپا کر پائے۔ بلکہ بنگالیوں کے الگ ہو جانے کے بعد باقی ماندہ پاکستان پر اشرافیہ طبقات یعنی فوج، بیوروکریسی، جاگیردار، سرمایہ دار اور مذہبی طبقات زیادہ شدت سے قبضہ کر گئے ہیں اور عوامی صورتحال مزید زبوں حالی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔''نادار لوگ'' میں بھی مشرقی پاکستان کے

سانحے اور قوم کے سکتے کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

> جنگ میں شکست کے احساس نے قوم کے دل کو شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ نہ شکنجہ ڈھیلا ہوتا تھا، نہ جذبات کو نکاس کا راستہ ملتا تھا، ایک ''صُم بکم'' کی کیفیت تھی جس نے اسے موضوع ممنوعہ کی حیثیت دے دی تھی۔ گویا لوگ دِلوں کے دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے ہوں۔ اندر اندھیرے کی فضا تھی۔ آٹھ دس ماہ تک مستقل روشنی میں رہنے کے بعد اندھیرے کا پردہ یکدم جو گرا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ روشنی جو انھیں دکھائی جا رہی تھی، دن کی روشنی نہ تھی بلکہ رات کی روشنی تھی جو ہاتھ سے جلائی گئی بتیوں سے پیدا کی گئی تھی۔۔۔ اس قوم کو کئی بار لڑائی کے میدانوں میں ہار ہوئی تھی۔۔۔ مگر کبھی شکست کا احساس نہ ہوا تھا۔۔۔ اب اس فریب کاری نے جو اپنے ہی لوگوں نے اپنے ہی لوگوں پر روا رکھی تھی، اس ہار کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا۔۔۔ لوگوں کا اعتبار پہلے دوسروں پر، پھر اپنے آپ پر سے اُٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ (نادار لوگ، ص۴۵۳)

ناول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے عصر کے واقعات کا معروضی تجزیہ کرتا ہے اور انھیں ماجرے میں سمو کر قاری کی فکر کو جلا بخشتا ہے۔ ادیب سماج کا حساس فرد ہوتا ہے اور وہ سماج کی داخلی و خارجی کیفیات و احساسات کو تخلیقی اظہار دیتا ہے البتہ سانحہ مشرقی پاکستان پر کوئی ایسا ناول دستیاب نہیں ہے جو اس المیہ کے تمام امکانات کی کھوج لگاتا اور تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑے لاچار اور تقدیر کے رحم و کرم پر پڑے انسان کی کم مائیگی اور کرب کا احساس کر سکتا۔ ممکن ہے ابھی تک قوم ''اجتماعی سکتے'' سے نہ نکل سکی ہو۔ البتہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سانحہ کے کچھ ہی عرصہ بعد باقی ماندہ پاکستان مزید سانحوں کا شکار ہوتا چلا گیا سو قوم کا اجتماعی لاشعور ابھی انگڑائی نہیں لے سکا۔ ویسے بھی ادیب کسی ایک واقعے سے متاثر ہو کر جب تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو وہ واقعہ محض واقعہ نہیں رہتا اس کے ساتھ دیگر واقعات بھی اس کا موضوع بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں ابھی سیاسی قوتوں کو آزادی نہیں ملی۔ ابھی ایک خاص نظریہ اور فکر کی حامل اشرافیہ اقتدار و اختیار کی مالک ہے اور اسے یہ گوارا نہیں کہ عوام ایسے عصری شعور کے حامل ہو جائیں کہ ان کی جواب طلبی کریں۔ اردو غزل اور افسانے میں البتہ تخلیق کاروں نے اپنے عصری سانحوں کو موضوع بنایا ہے اور اپنے عصر کے مسائل جن میں ۱۹۷۱ء کے بعد اہم مسئلہ قومی شناخت کا تھا، اسے بھی برتا ہے۔ ادیب جب تک اپنے عصر کے مزاج کو سمجھے گا نہیں وہ بھرپور تخلیقی اظہار کر نہیں پائے گا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی عصری شعور کے اور ادیب کے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے زمانے اور اس کے شعور ہی سے تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔ لیکن یہ روح صرف زندگی کی یک رخی ترجمانی نہیں کرتی بلکہ اس میں لاتعداد رخوں کو سمیٹ کر اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔[۱۶]

سانحہ مشرقی پاکستان کا اردو ناول میں مؤثر اظہار نہ ہو سکنے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بڑے تخلیقی فنکار کے مشاہدے سے دور یہ المیہ رونما ہو رہا تھا کیونکہ اس المیے کے نتیجے میں جو کرب انگیز کیفیت ملک کے مغربی حصے میں رونما ہوئی اس کا اظہار افسانے میں تو خوب ہوا البتہ ''بستی'' کی حد تک ایک مناسب اظہار ناول میں بھی ہوا۔ ممکن ہے ابھی اس اظہار کی کئی اور جہتیں سامنے آتیں لیکن عوام کے پنپتے ہوئے سیاسی و سماجی شعور اور اپنے حقوق کے حصول کی بیداری کو ایک خاص حد سے تجاوز نہ کرنے دینے کے عمل نے ملک پر عالمی گماشتوں کی آشیرواد سے مارشل لا مسلط کر دیا گیا۔ اس طرح عوام ایک بار پھر بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر دیئے گئے اور پاکستانی قومیت کی شناخت کا بحران مزید دبیز ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ زاہد چوہدری، مشرقی پاکستان کی تحریک علیحدگی کا آغاز، نگارشات، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۵ء، ص۲۵

۲۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، مکتبہ سرمد، راولپنڈی، بارنہم، ۱۹۹۲ء، ص۲۱۴

۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی تلاش، فکشن ہاؤس، لاہور، س ن، ص

۴۔ آئین ٹالبوٹ، تاریخ پاکستان، مترجم: طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۲۴

۵۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱۹

۶۔ مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر، تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبع اول، ۲۰۰۲ء، ص۲۵۲

۷۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، ص۲۶۱

۸۔ بشیر احمد، ڈاکٹر، اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیئل کالج، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۵۸

۹۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، ص۲۹۰، ۲۹۱

۱۰۔ اے بی اشرف، مسائل ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۳۹۰

۱۱۔ احسان اکبر، ڈاکٹر، پاکستانی ناول: ہیت، رجحان اور امکان، مشمولہ: اردو ناول۔ تفہیم و تنقید، مرتبین، نعیم مظہر، ڈاکٹر، فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷۶

۱۲۔ بشیر احمد، ڈاکٹر، اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات، ص۶۰

۱۳۔ نجمہ صدیق، ڈاکٹر، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۲۵۴

۱۴۔ روبینہ شہناز، ڈاکٹر، اردو تنقید میں پاکستانی تصور قومیت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، طبع اول، ۲۰۰۷ء، ص۲۲۳

۱۵۔ ایس ایم وینکٹ رومانی، پاکستان میں امریکی کردار، مترجم، جاوید قاضی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۳۷۰

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۵